Dareecha-e-Tahqeeq
دریچۂ تحقیق
ISSN PRINT 2958-0005 ISSN Online 2790-9972
VOL 7, Issue 2
www.dareechaetahqeeq.com dareecha.tahqeeq@gmail.com
Research Article

شیزراکنول
ریسرچ سکالر، پی ایچ ڈی اردو مائی یونیورسٹی اسلام آباد
پروفیسرڈاکٹرسیداشفاق حسین بخاری
شعبہ اردو مائی یونیورسٹی اسلام آباد

مرزا غالب کا تصورِ مرگ

Shizra Kanwal
Research Scholar, PhD Urdu, My University, Islamabad
Professor Dr. Syed Ashfaq Hussain Bukhari
Department of Urdu My University, Islamabad

Mirza Ghalib Concept Of Death

In Ghalib's poetry, death is not just the end of life, but an important way to understand human existence, life and death, mortality and immortality, love, sorrow, and the human relationship with God. According to Ghalib, despite being an absolute certainty, death is not merely annihilation; rather, it is an important stage in understanding human consciousness, self-awareness, and the meaning of existence. For him, death is not only the completion of life but also a guarantee of life's meaning. Ghalib's concept of death encompasses religious, mystical, philosophical, and historical dimensions.
Keywords Mirza Ghalib, Concept Of Death, Life And Death, Mortality And Immortality, Existence And Non-Existence, Thought Philosophy Of Death

موت انسانی وجود کا وہ سچ ہے جسے انسان جتنا نظر انداز کرتا ہے، وہ اتنا ہی اس کے باطن میں گہرا اترتا جاتا ہے۔ زندگی کی تمام رونقیں، آرزوئیں، تعلقات اور فکری سرگرمیاں اسی احساسِ فنا کے حصار میں اپنی معنویت پاتی ہیں۔ اس تناظر میں دیکھیں تو کہا جا سکتا ہے کہ موت کا سوال دراصل زندگی کے مفہوم کا سوال ہے۔ فلسفے نے اسے وجود و عدم کے مسئلے کے طور پر دیکھا، مذہب نے اسے امتحان، انتقال اور آخرت کی طرف سفر قرار دیا، جبکہ صوفیانہ فنا کے پردے میں بقا کی حقیقت تلاش کی۔ اردو شاعری نے بھی اس بنیادی انسانی تجربے کو مختلف صورتوں میں موضوع بنایا۔ انسان زندگی کی معنویت بھی اسی وقت محسوس کرتا ہے جب اسے اس کے اختتام کا شعور ہو۔ موت انسانی وجود کی وہ اٹل حقیقت ہے جس سے فرار ممکن نہیں، مگر جس کی تفہیم ہر عہد، ہر تہذیب اور ہر فلسفے نے اپنے اپنے زاویہ نظر سے کی ہے۔ اردو شاعری میں مرگ کا تصور محض جسمانی فنا کے احساس تک محدود نہیں رہا بلکہ اس نے حیات، عشق، غم، تقدیر، وجود و عدم اور بقا کے بنیادی سوالات کو بھی اپنے دامن میں سمیٹا ہے۔

مرزا اسد اللہ خان غالب اردو شاعری کی اس روایت کے نمائندہ شاعر ہیں جن کے یہاں زندگی محض خارجی واقعات کا تسلسل نہیں بلکہ ایک پیچیدہ فکری اور باطنی تجربہ بن کر سامنے آتی ہے۔ ان کی شاعری میں حیات و ممات، وجود و عدم، عشق و غم، امید و یاس، خدا اور انسان کے

باہمی تعلق جیسے مسائل محض موضوعات کی حیثیت سے نہیں آتے بلکہ ایک دوسرے میں پیوست ہو کر ایک ایسے فکری نظام کی تشکیل کرتے ہیں جس میں انسانی وجود اپنی تمام تر بےبسی، آرزو، خود آگہی اور اضطراب کے ساتھ جلوہ گر ہوتا ہے۔ غالب کے یہاں موت، زندگی کی ضد نہیں بلکہ زندگی کے معنی کو واضح کرنے والی حقیقت ہے۔

ان کا معروف شعر اس تصور کی بنیادی ترجمانی کرتا ہے:

قیدِ حیات و بندِ غم، اصل میں دونوں ایک ہیں
موت سے پہلے آدمی غم سے نجات پائے کیوں؟(1)

یہ شعر غالب کے تصورِ مرگ کی تفہیم کے لیے اس لیے بھی اہم ہے کہ یہاں حیات اور موت کو الگ الگ خانوں میں نہیں رکھا گیا۔ "قیدِ حیات" اور "بندِ غم" کو ایک قرار دے کر غالب دراصل زندگی کی اس داخلی ساخت کی طرف اشارہ کرتے ہیں جس میں انسان کا ہونا ہی اس کے غم، آرزو، محرومی اور بے قراری کا سبب بنتا ہے۔ زندگی اگر خواہش کا نام ہے تو خواہش کے ساتھ محرومی بھی لازم ہے اور محرومی کے ساتھ غم۔ اس طرح غم زندگی سے باہر کوئی حادثہ نہیں رہتا بلکہ زندگی کے تجربے کا جزو بن جاتا ہے، اس لیے موت سے پہلے غم سے مکمل نجات ممکن نہیں۔ یہاں "موت سے پہلے" والا مصرع بھی توجہ طلب ہے، غالب موت کو غم کا خاتمہ قرار دے رہے ہیں، مگر یہ تصور کسی سادہ قنوطیت کا نتیجہ نہیں۔ اگر غالب محض زندگی سے بیزار شاعر ہوتے تو ان کی شاعری اور زندگی میں عشق، حسن، شراب، دوستی، محفل، گفتگو اور زندگی کی رنگینیوں کا یہ فراواں احساس پیدا نہ ہوتا۔

ان کے یہاں موت کی فکر دراصل زندگی کے شدید احساس سے پیدا ہوتی ہے جو شخص زندگی کو سطحی طور پر دیکھتا ہے اس کے لیے موت بھی محض ایک حادثہ ہے، لیکن جو شخص زندگی کے باطن تک اترتا ہے اس کے لیے موت وجود کے بنیادی سوال کی صورت اختیار کر لیتی ہے۔ غالب کے تصورِ مرگ کی درست اور کامل تفہیم کے لیے ایک نظر اس کے آباؤ اجداد پر ڈالنا ضروری ہے تاکہ غالب کے اجتماعی لاشعور بارے درست آگہی مل سکے۔ غالب کا شجرہ نسب نامور اہل سیف سے ملتا ہے جن میں الپ ارسلان، ملک شاہ اور سنجر جیسے عظیم جنگجو اور اہل سیف شامل ہیں۔

تفصیل کا یہ محل نہیں وہ خود کہتے ہیں:

؎سو پشت سے ہے پیشہ آبا سپہ گری
کچھ شاعری ذریعہ عزت نہیں مجھے(2)

غالب جس 'پیشہ آبا' کا ذکر کر رہے ہیں وہ ان کے دادا اور چچا تک چلا اور پھر منقطع ہو گیا۔ اس پیشہ میں انسان ہر آن موت کے خطرے سے دوچار رہتا ہے نتیجتاً موت کا ڈر یا خوف جاتا رہتا ہے۔یہی سبب ہے کہ غالب کہیں بھی موت سے خوفزدہ نظر نہیں آتے۔

ڈاکٹر انور سدید اس حوالے سے لکھتے ہیں:

"خاندانی عظمت و سطوت کے بارے میں غالب کا دعویٰ علائم درست ہو یا نہ ہو لیکن ایک بات ضرور ثابت ہے کہ غالب کے آباؤ اجداد کا محبوب ترین مشغلہ تیغ زنی اور سپہ گری تھا۔ یعنی موت کا یہ کھیل غالب کے آباؤ اجداد کے لیے رزق رسانی کا ایک ذریعہ بھی تھا اور وہ اسے مشغلے کے طور پر بھی اختیار کیے ہوئے تھے۔ اس سے ایک سطح پر تو یہ ظاہر ہوتا ہے کہ زندگی کو برقرار رکھنے اور رزق و سیم و زر حاصل کرنے کے لیے ایک اذیت ناک وسیلہ اختیار کیا گیا ہے تو دوسری سطح پر موت کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر دیکھنے کا رجحان بھی واضح ہوتا ہے۔

۔غالب کی شاعری میں یہ دونوں رجحان نمایاں طور پر موجود ہیں، جس سے ظاہر ہوتا ہے
کہ زندگی سے والہانہ محبت اور موت سے شدید بےخوفی غالب کی ذات میں موجود
تھی۔"(3)

اس اقتباس اور غالب کی شخصی زندگی، جہاں ہمیشہ موت رقصاں دکھائی دیتی ہے، کے تناظر میں دیکھیں تو غالب کی شخصیت میں موت سے بےخوفی بہت حد تک قابلِ فہم ہو جاتی ہے۔ غالب کو صغیر سنی سے لے کر دمِ آخر تک بار بار موت سے واسطہ پڑتا رہا جس کی وجہ سے موت کا خوف جاتا رہا۔ غالب ابھی بہت چھوٹے تھے جب ان کے والد عبداللہ بیگ راہیِ ملکِ عدم ہوئے۔ 1806ء میں ان کے چچا نصر اللہ بیگ کو موت نے آ لیا، غالب تب صرف نو برس کے تھے۔ ان دونوں اموات کے ساتھ ہی غالب کی کفالت کے تمام سلسلے موقوف ہو گئے۔ غالب کی زندگی کے بڑے صدمات میں ایک صدمہ ان کی اولاد کا نہ بچنا تھا۔ان کے ہاں سات بچے پیدا ہوئے لیکن کوئی بھی پندرہ ماہ سے زیادہ زندہ نہ رہا۔

نواب زین العابدین عارف کو لے پالک بیٹا بنایا لیکن وہ بھی عین جوانی میں موت کا شکار بنا۔ عارف کی ماں نے غالب کے سامنے آخری سانسیں لیں۔ غالب کا بھائی یوسف بیگ دیوانگی کے عالم میں موت کا لقمہ بنا، عزیزوں میں خسر الٰہی بخش معروف، علی بخش رنجور اور معام میں مومن و ذوق کو اپنے ہاتھوں سے سپردِ خاک کیا۔ عزیزوں، رشتہ داروں، شاگردوں، دوستوں اور اہل شہر کی اموات کا سلسلہ غالب کی اپنی موت تک جاری رہا۔1857ء کا پُرآشوب دور غالبؔ کے کئی عزیزوں اور جاننے والوں کو موت کی وادی میں ابدی نیند سلا گیا۔

غالب ایک خط میں لکھتے ہیں کہ :

"۔۔۔ خصوصاً اس فتنہ و آشوب میں تو کوئی میرا جانے والا نہ بچا
ہوگا۔ اس راہ سے تجھ کو، جو دوست اب باقی ہیں، بہت عزیز ہیں۔
واللہ دعا مانگتا ہوں کہ اب ان احباب میں سے کوئی میرے سامنے
نہ مرے۔ کیا معنی کہ جو میں مروں، کوئی میرا یاد کرنے والا اور مجھ
پر رونے والا بھی تو دنیا میں ہو۔"(4)

اموات کے اس پے درپے صدمات نے غالبؔ کو صرف ذہنی اذیت سے ہی دوچار نہیں کیا بلکہ بار بار موت کی لذت چکھنے کا موقع بھی دیا۔ آئے روز موت کے صدمات کو برداشت کرتے ہوئے غالبؔ ہر عزیز کے ساتھ خود کو بھی مرتا ہوا محسوس کرتے تھے۔ اغلب گمان ہے کہ غالبؔ کی ایک بار مرنے کی حسرت، انہیں حالات کی زادِ راہ ہو جو انہیں ہر روز موت سے دوچار کر رہی تھی۔

۔کہوں کس سے میں کہ کیا ہے شبِ غم بری بلا ہے
مجھے کیا برا تھا مرنا اگر ایک بار ہوتا(5)

نشانِ خاطر رہے کہ عزیز و اقارب کی اموات نے غالبؔ کو توڑ پھوڑ دیا ہو یا وہ ان کے سوگ میں ہی ڈوب کر رہ گیا ہو تو ایسا ہرگز نہیں ہے۔ وہ ہر عزیز کی موت پر صدمے سے ضرور گزرتا ہے لیکن وہ کسی بھی موت کو اپنی زندگی پر وارد نہیں ہونے دیتا۔ تاریخ گواہ ہے کہ غالبؔ نے کسی عزیز کی موت کو بھی زندگی کا نوحہ نہیں بنایا، کیونکہ وہ جانتا ہے کہ موت، زندگی کا ہی ناگزیر حصہ ہے۔ غالب کے تصورِ مرگ کی تفہیم کے لیے مرزا حاتم علی بیگ مہر کے نام لکھے خط کے یہ جملے بہت اہم ہیں، دیکھیے وہ زندگی اور موت کے بارے میں کیا خیالات رکھتے ہیں:

" ہم کو یہ باتیں پسند نہیں ،پینسٹھ برس کی عمر ہے،پچاس برس عالم رنگ وبو کی سیر کی۔ابتدائے شباب میں ایک مرشدِ کامل نے ہم کو یہ نصیحت کی کہ ہم کو زہد وورع منظور نہیں۔ہم مانع فسق وفجور نہیں۔پیو، کھاؤ،مزے اڑاؤ۔مگر یہ یاد رہے کہ مصری کی مکھی، شہد کی مکھی نہ بنو۔سومیرا اس نصیحت پر عمل رہاہے۔کسی کے مرنے کاوہ غم کرے جو آپ نہ مرے،کسی اشک افشانی، کہاں کی مرثیہ خوانی،آزادی کاشکر بجالاؤ، غم نہ کھاؤ۔۔۔"(6)

مرزاغالبؔ نے اتنی زیادہ اموات کا سامنا لیا ییکن پھر بھی وہ موت سے حوف زدہ ہیں دکھائی دیتے ھے ییکن یہ بھی ایک دل چسپ امر ہے کہ وہ اپنے خطوط اور شاعری میں متعدد مقامات پر موت کی آرزو کرتے دکھائی دیتے ہیں۔حالاں کہ ان کا یہ رویہ زندگی کی طرف حد درجہ مثبت ہے،وہ زندگی گزارتے ہوئے موت کی تمنا کیوں کرتے ہیں؟اس سوال کا جواب نفسیاتی حوالہ سے دیکھا جاسکتا ہے۔اکثر دیکھنے میں آیا ہے کہ رنج وغم اور مصائب وآلام کی شدت میں انسان خود کو ہلاک وتباہ کرنے کے منصوبے بناتا ہے۔مختلف طرح کی جسمانی وروحانی اذیتیں اٹھانے کی آرزو کرنے لگتا ہے،اپنے ان ذہنی منصوبوں اور آرزؤں سے اسے گہرا سکون اور شدید لذت حاصل ہوتی ہے۔دراصل انسان ایسے لمحات میں نفسیاتی طور پر اپنی قدروقیمت کو بہت بلند سمجھنے لگتا ہے۔خود کو تباہ وبرباد کرنے کے منصوبے کے ذریعے سمجھتا ہے کہ وہ کائنات کی نہایت قابلِ قدراورناگریز ہستی کو تباہ کر دے گا۔ اپنے اس طرزِ عمل سے گو یا وہ فطرت یا خالقِ ہستی سے بدلہ لینے کے تصور سے جی بہلاتا ہے، بدلہ دراصل وہ خود سے لے رہا ہے۔ بے کسی میں خود پر ہی تو بس چل سکتا ہے۔ نفسیات میں خود سے بدلہ لینے اور خود کو اذیت دینے کے منصوبے بنانے سے متعلق ایک مستقل باب ہے جو کہ خود پر رحم کھانے (Self Pity) کے ضمن میں آتا ہے۔ غالب کی موت کی آرزو اور تمنا اس تناظر میں کافی حد تک قابلِ فہم ہو جاتی ہے۔

مرزا غالب نے اپنی بہتر ستر سالہ زندگی میں کون سا دکھ نہیں اٹھایا؟ اور کون سا صدمہ نہیں جھیلا۔ ان کی اندوہناک سرگزشت سے ہر خاص و عام واقف ہے۔ ان کی زندگی بجا طور پر مایوسیوں اور نامرادیوں کی ایک طویل رات تھی لیکن یہ بھی غالب کا ہی کمال ہے کہ اپنی جمالیات اور روشن دماغی سے انہوں نے اپنے کلام کو جگمگائے رکھا۔ ان کی زندگی کو جس طرح کے مسائل نے گھیرے رکھا اس کی منظر کشی انہوں نے اپنے مکتوبات میں جا بجا کی ہے۔

مرزا قربان علی بیگ سالک کے نام خط سے یہ جملے ملاحظہ فرمائیں:

"۔۔۔ یہاں خدا سے بھی توقع باقی نہیں۔ مخلوق کا کیا ذکر؟کچھ بن نہیں آتی۔ اپنا آپ تماشائی بن گیا ہوں۔ رنج و ذلت سے خوش ہوتا ہوں۔ یعنی میں نے اپنے کو اپنا غیر تصور کیا ہے۔ جو دکھ مجھے پہنچتا ہے، کہتا ہوں: لو غالب کے ایک اور جوتی لگی۔ بہت اتراتا تھا کہ میں بڑا شاعر اور فارسی دان ہوں۔ آج دور دور تک ہم جواب نہیں۔ لے اب قرضداروں کو جواب دے۔ سچ تو یوں ہے، غالب کیا مرا، بڑا ملحد مرا۔ بڑا کافر مرا۔ ہم نے ازراہِ تعظیم، جسامادبگاہوں کو بعد ان کے 'جنت آرام گاہ' و 'عرش نشین' خطاب دیتے ہیں

چونکہ یہ اپنے آپ کو شاہِ قلم و سخن جانتا تھا، "سقراطِ وقت" اور "بادیہ زادیہ" خطاب تجویز کر رکھا ہے۔ "آیئے نجم الدولۃ بہادر! ایک قرضدار کا گریبان میں ہاتھ، ایک قرض دار بھوگ سنا رہا ہے۔ میں ان سے پوچھ رہا ہوں، اجی حضرت نواب صاحب! نواب کیسے، او فلاں صاحب! آپ سلجوقی اور افراسیابی ہیں۔ یہ کیا بے حرمتی ہو رہی ہے؟ کچھ تو لکھو، کچھ تو بولو۔ بولے کیا، بے حیا، بے غیرت، کوٹھی سے شراب، گندھی سے گلاب، بزاز سے کپڑا، میوہ فروش سے عام، صراف سے دام قرض لیے جاتا تھا، نہ یہ بھی سوچا ہوتا کہاں سے دوں گا؟۔"(7)

غالب کے خط کے اس اقتباس کے پیچھے بھی وہی نفسیاتی خود اذیت پسندی کا جذبہ کار فرما دیکھا جاسکتا ہے جس کا گزشتہ سطور میں ذکر ہوا۔ غالب کو مرنے سے کوئی خوف نہیں۔ جینے اور مرنے دونوں کو وہ کسی کھیل تماشے سے زیادہ اہمیت نہیں دیتے۔ یہ زندگی کی وہی کیفیت ہے جو غالب نے حالات کی مستقم ظریفی سے مقابلہ کرنے کے لیے وضع کی تھی، یہاں موجود اور ناموجود کے احوال باطل ہو جاتے ہیں۔ وہ ہمیں ایک نئے فلسفہ زندگی سے روشناس کرواتے ہیں اور یہ وہ رنگ ہے جسے دنیا سے الگ کر کے غالب نے اپنے لیے مخصوص کرر کھا تھا کیونکہ جو زندگی انہیں ملی تھی وہ عمومی طور پر اگر گزاری جائے تو پیچ میں ہی سب کچھ تہس نہس ہو کر رہ جائے گا۔

مرزا غالب اپنے عہد کا ایک بڑا اور روشن دماغ تھا، یہی وجہ ہے کہ انہوں نے بنے بنائے راستوں پر چلنے کی بجائے نئے راستے خود تراشے۔ افکار و عقائد کے معاملے میں بھی وہ عامِ زمانی روش سے ہٹ کر خیالات رکھتے ہیں۔ نظریات و عقائد اور طرزِ زیست یا پھر طرزِ زیست، وہ ہر حوالے سے تقلید کے قائل نہیں تھے۔ وہ افکار و خیالات میں جدت اور ندرت کے قائل تھے۔ ان کا عہد زوال پذیر عہد تھا اور ایسے عہد میں معاشرے پر مذہب اور مذہبی اقدار کا غلبہ ہو جاتا ہے۔غالب ایسے معاشرے میں رہتے ہوئے بھی مذہب سے آزاد اور بے گانہ ہی رہے۔

خلیفہ عبدالحکیم اس بابت رقمطراز ہیں:

"غالب ایک آزاد منش آزادہ رو شخص ہے۔ یہی آزادہ روی کبھی بے راہ روی بن جاتی ہے اور کبھی ندرت آفرینی، رندی ہو یا قلندری رسوم و قیود سے آزادی کا نام ہے۔ غالب افکار میں بھی آزاد تھا اور عقائد میں بھی۔ اسی طرح فن میں بھی وہ تقلیدِ محض سے متنفر تھا۔"(8)

غالب کے ہاں متعدد مثالیں موجود ہیں جہاں وہ زمانے کی مسلمہ اقدار پر چوٹ کرتے نظر آتے ہیں۔ وہ معاشرتی روایات و اقدار ہوں یا پھر مذہبی روایات و اقدار، وہ کہیں بھی تقلیدِ محض کے قائل نظر نہیں آتے۔ان کے اشعار ملاحظہ فرمائیں جہاں وہ مسلمات کا مضحکہ اڑاتے نظر آتے ہیں:

؎ہم کو معلوم ہے جنت کی حقیقت لیکن
دل کے خوش رکھنے کو غالب یہ خیال اچھا ہے(9)

؎کیوں نہ فردوس میں دوزخ کو ملالیں یارب؟
سیر کے واسطے تھوڑی سی فضا اور سہی(10)

؎زندگی اپنی جب اس شکل سے گزری غالب
ہم بھی کیا یاد کریں گے کہ خدا رکھتے تھے(11)

؎واعظ نہ تم پیو نہ کسی کو پلا سکو
کیا بات ہے تمہاری شرابِ طہور کی(12)

؎پکڑے جاتے ہیں فرشتوں کے لکھے پر ناحق
آدمی کوئی ہمارا دمِ تحریر بھی تھا؟(13)

مرزا غالبؔ کے درج بالا اور اسی قبیل کے دیگر اشعار سے اندازہ ہو جاتا ہے کہ وہ روایتی تصورات کا اسیر نہیں۔ گناہ و ثواب، زندگی و موت، جنت و جہنم، حرام و حلال سمیت دیگر مسلمہ اقدار اور تصورات کا منکر اور انکاری ہے۔ اس کا مجتہدانہ دماغ زندگی و مرگ سے متعلق عام زحافی اور مذہبی تصورات کو قبول نہیں کرتا نتیجتاً اس کے ہاں زندگی اور موت کے تصورات بھی عام زمانے سے یکسر الگ ہیں۔

غالبؔ کہیں بھی سطحیت کا شکار نہیں ہوتے، جنت کا تذکرہ سنیے ان کی زبانی:

ستائش گر ہے زاہد اس قدر جس باغِ رضواں کا
وہ ایک گلدستہ ہے ہم بےخودوں کے طاقِ نسیاں کا(14)

غالبؔ کے اس شعر سے بہت عمدگی سے وضاحت ہو رہی ہے کہ زاہد جس باغِ رضواں کا ستائش گر ہے غالب کہہ رہے ہیں کہ ہم جیسے بےخود اسے طاقِ نسیاں پہ رکھ کر بھول چکے ہیں۔ زاہد اس باغِ رضواں کی اس قدر تعریف کرتا ہے گویا اس کی تمام تر روحانی زندگی کا مرکز جنت ہی ہو، ہمارے لیے وہی جنت محض ایک گلدستہ ہے جو طاقِ نسیاں کی زینت بنا ہوا ہے۔

ڈاکٹر شمس الرحمن فاروقی اس شعر کی شرح میں لکھتے ہیں کہ:

"شعر کے اصل معنی یہ ہیں کہ زاہد جس جنت کی تعریف میں رطب اللسان ہے وہ ہمارے لیے وجود ہی نہیں رکھتی۔ ہم جنت جہنم جیسے سطحی تصورات سے آزاد ہیں۔ ہمارے استغراق فی الحقیقت کا یہ عالم ہے کہ ہم جزا و سزا سے ماورا ہو گئے ہیں۔"(15)

غالبؔ کے ہاں دیگر تصورات و عقائد کی طرح موت / مرگ کا تصور بھی روایتی تصور ہرگز نہیں ہے۔ غالبؔ کے ہاں موت جبرِ مشیت نہیں بلکہ ان کے نزدیک مرگ، زندگی کی طویل اور پر صعوبت شاہراہ پر ایک موڑ ہے جیسے ہی یہ موڑ گزرے گا تو ایک نئی زیست کا در وا ہو جائے گا جو دائم بھی ہوگی اور پر نشاط بھی۔

غالبؔ کے تصورِ مرگ کو محض موت کا ایک روایتی یا مذہبی تصور کے طور پر دیکھنا اس کے فکری نظام کو محدود کر دیتا ہے۔ ان کے ہاں موت انسانی وجود کی ناگزیر حقیقت ہے جو زندگی کے شعور کو زیادہ گہرا کر دیتی ہے۔ غالب کے ہاں موت جبرِ مشیت نہیں بلکہ ان کے نزدیک مرگ، زندگی کی طویل اور پر صعوبت شاہراہ پر ایک موڑ ہے، جیسے ہی یہ موڑ گزرے گا تو ایک نئی زیست کا در وا ہو جائے گا، جو دائم بھی ہوگی اور پر نشاط بھی۔ دوسرے لفظوں میں غالب کی شاعری میں مرگ کا تصور بنیادی طور پر بقا اور فنا کے باہمی رشتے سے تشکیل پاتا ہے۔ انسانی زندگی ان کے نزدیک ایک عارضی قیام ہے، جس کی حقیقت مسلسل زوال اور تغیر سے عبارت ہے۔ یہی احساس ان کے اس معروف شعر میں جامعیت سے ظاہر ہو رہا ہے:

؎موت کا ایک دن معین ہے
نیند کیوں رات بھر نہیں آتی؟(16)

یہاں موت کا یقین اور انسانی اضطراب ایک دوسرے کے مقابل کھڑے ہیں۔ عقل جانتی ہے کہ موت کا وقت مقرر ہے مگر نفس اس علم کے باوجود اضطراب سے نجات نہیں پاتا۔ "رات بھر نیند نہ آنا" دراصل انسانی وجود کی اس داخلی کشمکش کی علامت ہے جس میں یقینِ موت اور خوفِ موت بیک وقت موجود ہیں۔ غالب اس تضاد کو کسی وعظ یا فلسفیانہ مقولے کے ذریعے نہیں بلکہ ایک نہایت سادہ اور روزمرہ تجربے کے وسیلے سے نمایاں کرتے ہیں۔غالب کے تصورِ مرگ کا ایک اہم پہلو یہ ہے کہ وہ موت کو زندگی کی ضد کے بجائے اس کا تکملہ سمجھتے ہیں۔ ان کے یہاں زندگی کی معنویت فنا کے احساس سے الگ نہیں، اسی لیے وہ موت کے تصور کو عشق اور آرزو سے بھی مربوط کرتے ہیں۔ انسان کی خواہشات لامحدود ہیں جبکہ زندگی محدود؛ یہی عدمِ تناسب غالبؔ کے ہاں المیہ شعور پیدا کرتا ہے۔خواہش جتنی وسیع ہوتی ہے، زندگی کی محدودیت اتنی ہی نمایاں ہوتی ہے۔

غالبؔ کے خطوط میں موت کا تصور نسبتاً زیادہ بےتکلف اور شخصی انداز میں سامنے آتا ہے۔ دوستوں اور عزیزوں کی وفات کے مواقع پر ان کا لہجہ رسمی سوگ سے مختلف نظر آتا ہے۔ وہ موت کو انسانی تجربے کی عمومی حقیقت سمجھتے ہیں اور بعض مقامات پر اس کے ساتھ ایک ایسی فکری مانوسیت پیداکرتے ہیں جو ان کے طنزیہ مزاج سے ہم آہنگ ہے۔ یہی وجہ ہے کہ غالب کے ہاں موت صرف المیہ نہیں، وہ کبھی کبھی انسانی غرور اور دنیاوی تعلقات کی ناپائیداری پر طنز کا وسیلہ بھی بن جاتی ہے۔

غالب کو محض 'موت سے بےخوف شاعر' قرار دینا بھی درست نہیں ہوگا؛ ان کے شعری وجود میں موت کا خوف، زندگی کی محبت، فنا کا شعور اور بقا کی خواہش بیک وقت کارفرما ہیں۔ ان کا کمال یہی ہے کہ وہ ان متضاد احساسات کو ایک دوسرے کی نفی نہیں بننے دیتے۔ ان کے نزدیک موت ایک ایسی حقیقت ہے جس سے فرار ممکن نہیں، لیکن اس کا ادراک انسان کو زندگی کے تجربی تجربے سے بےدخل نہیں کرتا، بلکہ اسے زندگی کی قدر، عشق کی شدت اور وجود کی ناپائیداری کا زیادہ گہرا شعور عطا کرتا ہے۔

غالب کا تصورِ مرگ بنیادی طور پر وجودی شعور کا تصور ہے۔ موت ان کے لیے اختتام کا نام ضرور ہے مگر اس اختتام کے احساس میں زندگی کی معنویت بھی مضمر ہے۔ یہی سبب ہے کہ غالب کی شاعری میں موت کبھی خوف کی صورت میں، کبھی حسرت کی صورت میں، کبھی طنز کے پردے میں اور کبھی فلسفیانہ سوال کی شکل میں نمودار ہوتی ہے۔ ان کا شعورِ مرگ دراصل شعورِ حیات کا دوسرا نام ہے؛ وہ موت کو سمجھنے کی کوشش کرتے ہوئے انسان، زندگی اور اپنے وجود کے اسرار کو سمجھنے کی کوشش کرتے ہیں۔ یہی دوئی اور یہی داخلی کشمکش غالب کے تصورِ مرگ کو اردو شاعری کے روایتی تصورِ فنا سے ممتاز کر کے اسے فکری، فلسفیانہ اور وجودی معنویت عطا کرتی ہے۔

حوالہ جات

1)۔ دیوانِ غالب، مرتبہ امتیاز علی خان عرشی، مجلسِ ترقیِ ادب، لاہور، 1992ء، صفحہ نمبر 241

2)۔ ایضاً، صفحہ نمبر 136

3)۔ ڈاکٹر انور سدید، "غالب اور تصورِ مرگ" مشمولہ نقوش (غالب نمبر) (مدیر: محمد طفیل)، ادارہ فروغِ اردو، لاہور، فروری 1969ء، صفحہ نمبر 626

4)۔ خطوطِ غالب، مرتبہ غلام رسول مہر، شیخ غلام علی اینڈ سنز، لاہور، صفحہ نمبر 317

5)۔ دیوانِ غالب، مرتبہ امتیاز علی خان عرشی، مجلسِ ترقیِ ادب، صفحہ نمبر 187

6)۔ خطوطِ غالب، مرتبہ غلام رسول مہر، محولابالا، صفحہ نمبر 196

7)۔ خطوطِ غالب، مرتبہ غلام رسول مہر، تحویل البالد، صفحہ نمبر 96

8)۔ ڈاکٹر خلیفہ عبدالحکیم، افکارِ غالب، مکتبہ معین الادب، لاہور، 1954ء، صفحہ نمبر 79

9)۔ دیوانِ غالب، مرتبہ امتیاز علی خان عرشی، تحویل البالد، صفحہ نمبر 318

10)۔ ایضاً، صفحہ نمبر 432

11)۔ ایضاً، صفحہ نمبر 308

12)۔ ایضاً، دیوانِ غالب مرتبہ امتیاز علی خان عرشی، تحویل البالد، صفحہ نمبر 324

13)۔ ایضاً، صفحہ نمبر 186

14)۔ دیوانِ غالب، ایضاً، صفحہ نمبر 182

15)۔ ڈاکٹر شمس الرحمن فاروقی، تفہیمِ غالب، غالب انسٹی ٹیوٹ، نئی دہلی، 1989ء، صفحہ نمبر 33

16)۔ دیوانِ غالب، مرتبہ امتیاز علی خان عرشی، نسخۂ نالب، صفحہ نمبر 314